افکار و آراء

سمندر پار سے دو خط

(۱)

ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی نئی کتاب "ISLAM" کی یہاں بہت تعریف ہے۔ کچھ اعلیٰ درجے کے طلبہ ہیں۔ احمد سے دریک (الجزائر)، ابو زید (سوڈان)، روشن سینز یڈ (ترکی)، میلو (فرانس)، پیلیشن (امریکہ)۔ سب کے ساتھ باتیں ہوئیں۔ ان سب نے کتاب دیکھی ہے۔ اگرچہ ابھی یہ یونیورسٹی میں باقاعدہ کارڈ بن کر داخل نہیں ہوئی لیکن ان لوگوں کے اشتیاق کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کتاب آتے ہی ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ ایک دن چائے پر بات ہو رہی تھی تو ابو زید نے کہا کہ فضل الرحمٰن پاکستان کے لئے ASSET ہیں۔ لیکن یہ جملہ اس نے اس انداز سے کہا جیسے پاکستان کی حالت پر اُسے بے حد رشک آ رہا ہو، حالاں کہ پاکستان میں ان کے بارے میں جو باتیں مشہور ہیں اور جس انداز سے انہیں دیکھا جاتا ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔

پرسوں ٹرینیڈاڈ کے دو عیسائی طلبہ سے، جو اسلام کے بارے میں یہاں ایک کورس لے رہے ہیں، بات ہو رہی تھی، دونوں کا خیال تھا کہ عیسائی الٰہیات کی بہت سی پیچیدگیاں اسلام کے مطالعے سے دور ہو سکتی ہیں۔ دونوں کا اس پہلو پر کام کرنے کا ارادہ ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگرچہ مجھے عیسائیت کے بارے میں تفصیلات کا علم نہیں لیکن غالباً عیسائیت میں چوں کہ عمل سے زیادہ ایمان پر زور دیا گیا اس لئے عیسائیت عملی مذہب نہیں رہا۔ اس کے برعکس اسلام ابتدا سے ہی ایک عملی مذہب تھا، اس نے ایمان سے زیادہ عمل پر توجہ دی۔ انہوں نے اس سے اتفاق کیا۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ ہم نے کیا عمل پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں دیا جس کا نتیجہ ظاہر پرستی اور راسامیت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یا یوں کہئے کہ ہم نے عمل کو ایمان

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

کا درجہ دے دیا جس سے انتہا درجے کی قدامت پرستی ظاہر ہوئی اور آگے بڑھنے کے راستے مسدود ہو گئے۔ انقلاب کی بجائے احتساب اور PROGRESS کی جگہ (CONFORMISM) نے لے لی۔

یہ غالباً تاریخ اسلام کا عجیب ترین واقعہ یا سانحہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں اسلامی فکر میں دو رجحانات ابھرے۔ ایک CONFORMIST تھا جو اہل حدیث کے نام سے مشہور ہوا۔ ایک DYNAMIST تھا جو اہل الرائے کہلایا۔ بعد میں ایک واضح طور پر حنبلی مذہب بنا اور دوسرا حنفی۔ حنبلی ظاہر پرستی کی انتہا پر تھے، اور ہر تبدیلی کے مخالف۔ حنفی اس کے برعکس روح اجماع کے قائل تھے۔ لیکن ہوا کیا اور یہ فکر اسلامی کا المیہ پہلو ہے کہ حنفی قدامت پرستی اور ظاہر پرستی کا مرکز بن گئے اور اہل حدیث ابن تیمیہ، عبدالوہاب، سنوسی وغیرہ کے ذریعے NON-COFORMIST خیالات لے کر ابھرے۔ اب مجھے نام یاد نہیں آ رہا، کسی بزرگ نے کہا تھا کہ جو معاشرہ کے خلاف بغاوت کرنا اور نئی راہ نکالنا چاہتا ہے وہ پہلے اہل حدیث بنتا ہے۔ میرے خیال میں یہ بات آج کی مسلم فکری تحریکوں پر بھی صادق آتی ہے۔ کہ سب نئی تحریکیں جب اسلامی رنگ میں ابھرتی ہیں تو پہلے اہل حدیث مکتب فکر کا سہارا لیتی ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہی ہے کہ اہل سنت نے اجماع کو قانون کا آلہ یا ذریعہ قرار دینے کی بجائے مآخذ قرار دیا جس سے وہ اصول جو ترقی کا وسیلہ بن سکتا تھا، جمود کی فصیل بن گیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ آج کا مسلمان خواہ وہ قدامت پسند ہو یا ترقی پسند، سب سے زیادہ حساس حدیث کے بارے میں ہے، ایک اس کے دفاع میں کتابوں پر کتابیں لکھ رہا ہے، ایک اس کا سرے سے انکار کر رہا ہے۔ حالاں کہ حدیث اصلاً ظاہر پرستی کی جڑ ہے۔ اسلامی قانون بلکہ معاشرے کا اصل اصول اجماع ہے۔ اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ اگر توجہ ہے بھی تو اصول فقہ میں اسے ایک مآخذ کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے اور وہ بھی اکثر محض صحابہ کے اجماع تک محدود رکھتے ہیں۔ اگرچہ عملاً اس اجماع کے بھی پابند ہو جاتے ہیں جس سے ان کا علمی اور معاشی رشتہ وابستہ ہوتا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اجماع کو ماخذ کی بجائے وسیلہ اور اصول کے طور پر منوایا جائے تاکہ فکری آزادی کی راہیں کھلیں اور یہ جمود ختم ہو۔

معاف کیجئے گا، یہ باتیں اس لئے لکھ دیتا ہوں کہ اگر ان میں غلط نتائج کی بنا پر کوئی غلط نظریہ پیش کر رہا ہوں تو آپ لوگ اصلاح فرما دیں گے۔

خالد

۲۰ اپریل، مانٹریال

(۲)

اس مرتبہ تاریخ کا پرچہ بہت دلچسپ رہا۔ اس سلسلے میں مارشل جی ایس ہاجسن کا ایک بنیادی مضمون اور کچھ کتابیں دیکھنے کا موقع ملا۔ اسلامی تہذیب پر لکھنے والوں کے لئے جو مسئلہ سب سے زیادہ جاذبِ توجہ رہا ہے، وہ اسلامی تہذیب کی وحدت ہے۔ اتنے مختلف ممالک اور مختلف اقوام میں اسلام پھیلا، لیکن اس کثرت میں بھی اس کی ایک وحدت ہے جو صدیوں سے قائم ہے۔ پروفیسر گب کے نزدیک اس وحدت کا بنیادی عنصر شریعت (قانون) ہے۔ اور یہ تعبیر بہت عرصے تک مسلّم رہی۔ حال ہی میں گرونے بام نے (جو اینتھروپالوجسٹ ہے) اس کا دوسرے نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا اور اس وحدت کے دوسرے عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے دلچسپ مطالعہ ہاجسن کا ہے۔ موصوف نے گو فیصلہ کن انداز سے کسی بھی ایک عنصر کو اس وحدت کا تمام تر ذمہ دار قرار نہیں دیا تاہم اس نے تاریخِ اسلامی کے مطالعے کے لئے نئے خطوط ضرور فراہم کر دیئے۔ ایک تو وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسانی تاریخ کے دورِ جدید اور انسانی اقدار کے لئے اسلامی تہذیب کو اس کے ماضی کے پسِ منظر میں سمجھنا ضروری ہے، دوسرے تہذیبِ اسلامی کی یہ خصوصیت کہ اس نے اپنی ہم عصر یا سابقہ تہذیبوں کو ختم نہیں کیا بلکہ ان کو اپنے اندر سمو کے آج کے دَور کے لئے باقی رکھا، اس کے گہرے مطالعے کا شدید مطالبہ کرتا ہے۔

اب تک تاریخ اسلامی کے مطالعے میں وحدت برقرار نہیں رکھی جاتی تھی۔ بلکہ اُس کی سرے سے تلاش ہی نہیں کی جاتی تھی۔ اس میں کئی ایسے مقام آتے تھے جہاں تاریخِ اسلام کو اس طرح ختم سمجھا جاتا تھا کہ اس کے بعد کے دَور کو پہلے سے کوئی مناسبت نہیں رہی تھی۔ اس طرح کی جراحانہ تقسیم کی پہلی کاٹ خلفائے راشدین کے اختتام پر، دوسری بڑی کاٹ زوالِ خلافتِ بغداد پر فرض کر لی گئی تھی، دوسری کاٹ اس لحاظ سے بہت نتیجہ خیز ہے کہ اس کے بعد کی تاریخ اسلام علاقوں میں منقسم اور ایک دوسرے سے بے تعلق فرض کر لی گئی ہے۔ یہ تاریخ اسلام کے لئے زوالِ بغداد سے بھی بڑا سانحہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم و غیر مسلم تمام اسلام پر لکھنے والوں کے لئے اسلام اور عربیت لازم و ملزوم قرار پائے۔ اس سے جو نتائج برآمد ہوئے وہ ہمارے سامنے ہیں۔ ہاجسن اس رجحان کو "عربی تعصب" قرار دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اُس کے نزدیک اسلام صرف مصر اور شام میں محدود ہو کر رہ گیا۔ اور جدید پاکستان، مشرقِ بعید، افریقہ، ایران اور اناطولیہ کا اسلام سے سرسری تعلق سمجھا گیا۔ علوم و فنون میں تقلید کا آغاز ہوا۔ اور اس سارے دَور کو اسلام کے زوال کی تاریخ

شمار کر دیا گیا۔

ہاجسن کا کہنا ہے کہ اس کے برعکس جتنی اسلام کی اشاعت اس دَور میں ہوئی، وہ اس سے قبل نہیں ہوئی اور یہ اشاعت حکمران مسلمانوں کے زیرِ اثر نہیں بلکہ اصحابِ دل صوفیہ کے ہاتھوں ہوئی۔ جو ان علاقوں میں اسلام لے گئے جہاں حریف مذہب زیادہ طاقت ور تھا، اور آج تک اسلام ان علاقوں میں پورے اعتماد اور عزم کے ساتھ بڑھ رہا ہے اور بہت حد تک اسلام نے ان علاقوں میں پہنچ کر جو ماضی کے خول کو توڑ دینے کے رجحانات پیدا کئے تھے، وہ ان علاقوں کی جدید زندگی کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

یہ تو تھی دو کاٹوں کی کہانی اور میرے خیال میں تیسری کاٹ شاید خلافتِ عثمانیہ کے اختتام پر سمجھ لی گئی، اور سیکولرزم کو اسلام کا حریف قرار دے کر مفروضہ زوال کے ایک نئے دَور کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ اگر غور سے دیکھئے تو یہ ان لوگوں کے مفروضے ہیں جو ایک عرصے تک ایک خاص روشنی میں رہتے رہتے نئی روشنی آنے پر اُن کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ حالانکہ جیسے انہوں نے عربوں کے بعد خلافتِ عثمانیہ کو قبول کیا تھا ایسے ہی اُسے بھی قبول کر لینا چاہیئے۔

اگر یہ لوگ اسلامی تہذیب کو ایک جاندار تہذیب مان لیں تو شاید ان کی پریشانیاں کم ہو جائیں۔

خالد

۹ مئی، مانٹریال (کینیڈا)

ہمارے علماء کرام :-

علماء کے طبقے کو دیکھئے — تو اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دین جیسا کچھ اور جتنا کچھ آج موجود ہے وہ انہی کے دم سے اور انہی کی کوششوں کی بدولت ہے۔ — اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس طبقے میں کہیں کہیں علم و عرفان کی شمعیں بھی روشن ہیں، اور ایمان و ایقان کی مشعلیں بھی۔ اور ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اصحابِ علم بھی ہیں اور اربابِ عمل بھی، جن کی گفتار قلوب میں گداز پیدا کرنے والی اور کردار لوگوں کے لئے عزیمت کا سامان مہیا کرنے والا ہے — لیکن یہ بھی ایک دردناک حقیقت ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے اور علماء کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ نہ دلوں میں ایمان کی شمع ایسی روشن ہے کہ ماحول کو منور کر سکے۔ نہ اخلاق و اعمال اس درجے کے ہیں کہ لوگوں کے دلوں

میں گھر کر سکیں۔ تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس ان کی ایک بڑی اکثریت کا پیشہ بن کر رہ گیا ہے اور بڑے بڑے دارالعلوموں میں یہ افسوس ناک اور تکلیف دہ صورتِ حال نظر آتی ہے کہ پیشہ ورانہ چشمک اور رقابت و حسد — اور آپس کے جھگڑوں اور مناقشوں کے اعتبار سے وہ خالص دنیادار اداروں سے کسی طرح مختلف نہیں۔

رہی یہ کمی کہ ان کی ایک بڑی اکثریت موجودہ دنیا کے علوم و فنون سے بیگانہ محض ہے۔ تو اس کا ذکر تحصیل حاصل ہے! اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ علماء کا اثر معاشرے کے طبقہ متوسط کے بھی صرف نصفِ ادنیٰ تک ہی پہنچ پاتا ہے اور موجودہ معاشرے میں ان کی حیثیت زندگی کی اصل منجھدار سے کٹی ہوئی ایک علیحدہ شاخ سے زیادہ کچھ نہیں! —

ہماری قومی زندگی کا دھارا پورے زور شور سے ایک خاص سمت میں بہہ رہا ہے۔ اور تا حال مذہبی طاقتیں اس پر کسی قسم کا کوئی اثر ڈالنے اور اس کے رُخ کو تبدیل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ دوسری طرف ملکی حکومت کو ہر آن نئی مشکلات و مسائل کا سامنا ہے۔ اور بین الاقوامی سیاست کے بدلتے ہوئے رنگ اور بڑی طاقتوں کی بدلتی ہوئی حکمت عملی سے صاف اندازہ ہو رہا ہے کہ مستقبل قریب میں پاکستان کو اپنی سالمیت کے تحفظ کے لئے بڑی کٹھن مشقت و ریاضت کرنی ہوگی، اور بڑے نامساعد حالات سے گزرنا ہوگا۔ ان حالات میں اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ اگر مذہبی حلقوں کی رزمی سیاسی نعرہ بازی اور محض منفی مدافعت و مخالفت کی حالیہ روش برقرار رہی اور کوئی زبردست مثبت دینی دعوت ایسی نہ اٹھی جو ذہنوں کو مفتوح اور قلوب کو مسخر کر سکے تو کسی مشکل وقت میں اعصاب کا تناؤ ایسی صورت پیدا نہ کر دے کہ پھر اسلام کا نام لینا بھی مشکل ہو جائے — !

(ماہنامہ "میثاق"، لاہور، مئی ۱۹۶۷ء)

طابع: ظہیر الدین مطبع: استقلال پریس لاہور
ناشر: ڈاکٹر فضل الرحمٰن، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، راول پنڈی۔